

دین کا جامع تصور

سید قطب شہید

(ترجمہ: عبدالحمید صدیقی)

دین اور دنیا کی دوئی کا تصور یکسر غلط اور باطل ہے۔ دین حق انسانی زندگی کا ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس بنا پر وہ کبھی اپنے دائرہ کار کو محض وجدانی کیفیات، بے جان اخلاقی ضابطوں، مذہبی رسوم، گیان دھیان کی مختلف ریاضتوں اور طور طریقوں تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ وہ کیسے زندگی کے محض ایک گوشے میں سمٹ کر رہ سکتا ہے جسے آج کل کی مذہبی اصطلاح میں ایک شخصی معاملہ کہا جاتا ہے؛ دین حق یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کو حیات بشری کے ایک نہایت ہی کمزور حصے کا حاکم مانا جائے اور باقی زندگی جھوٹے خداؤں کی سرپرستی میں بسر کی جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہونگے کہ انفرادی زندگی میں تو انسان خدا کے بنائے ہوئے اخلاقی ضابطوں کا پابند ہو مگر اجتماعی زندگی میں وہ یا تو خود اپنی خواہشات کی پیروی کرے یا انسانوں کے وضع کیے ہوئے اصولوں کو اپنائے۔ پھر یہ بات بھی اسلام کے تصور دین کے خلاف

۱۷ یہ مضمون سید قطب شہید کی ایک معروف کتاب المستقبل لہذا الدین کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ پوری

کتاب کا ترجمہ ادارہ معارف اسلامی، کراچی شائع کر رہا ہے۔

(حقیقہ اشارات)

۱۸۔ تو میں جنہوں نے حیات انسانی کا ثوارہ کر کے اس کے کچھ حصے قیصر کو اور کچھ خدا کو دے دیئے ہیں۔ انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ کیا یہ تقسیم غلط اور غیر فطری تو نہیں۔ اور کیا جن حصوں کو وہ قیصر کے حصے سمجھ کر ان پر انسان کے قوانین نافذ کر رہے ہیں وہ خدا کی خدائی کی تکذیب اور اس کے حقوق پر ڈاکہ تو نہیں۔

ہے کہ وہ انسان کو آخری فلاح کا راستہ تزیاتے مگر اس دنیا کے لیے اُسے کوئی رہنمائی نہ دے اور لوگ خلافتِ الہی کی ذمہ داریوں سے یکسر بے پروا ہو کر امورِ دنیا کو جس بیچ پر چاہیں چلا تے رہیں۔ دین کی یکزور حیثیت یوں بھی خلافِ عقل ہے۔ لیکن اسلام جو اللہ کا سچا دین ہے وہ تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پست حیثیت کو گوارا نہیں کر سکتا۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ دین کس طرح دنیاوی معاملات سے بے تعلق ہوتا گیا۔

دین اور دنیا کی تفریق کا نظریہ یورپ سے دنیا کی دوسری قوموں کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اس بل نظریے نے اہل یورپ کی بلکہ پوری انسانیت کی زندگی کو غدا بنا رکھا ہے۔ یہ نظریہ وقتاً بھر کر سامنے نہیں آیا بلکہ تاریخ کے ایک لمبے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی رہنمائی و ہدایت کے لیے انبیاء بھی مبعوث فرمائے، اور انہیں کتبِ سماوی سے بھی نوازا۔ سنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے خانی کائنات نے بکثرت پیغمبر بھیجے جنہوں نے انہیں حق اور صداقت کی راہ دکھانے کی پوری پوری کوشش کی مگر انہوں نے دھڑے بندیوں اور تعصبات میں گرفتار ہو کر ان کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا مذہبی پدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ان کے پاس جب حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر گئے تو وہ محض اس بنا پر ان کے دشمن بن گئے کہ انہوں نے ان کی غلط روش پر انہیں ٹوکا تو قرآن مجید حضرت مسیح کے پیغام اور دعوت کو یوں بیان کرتا ہے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ
وَالْحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ
جُتُّكُمْ بآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَانفُوا اللَّهَ وَ
أَطِيعُوا - (آل عمران - ۵۰)

اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراہ میں اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔

دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

لے ہرنے نبی کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی پچھلے انبیاء کی ترویج و تفسیر نہیں کر رہے بلکہ حضرت موسیٰ اور ان کی شریعت کی تائید و توثیق کر رہے ہیں اور یہودیوں کو بتا رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسیٰ کو مٹانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ خود کو نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ انہیں شریعت موسوی بلکہ اُس کی تجدید کے لیے آیا ہوں۔ اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے ارشاد:

ملاحظہ ہوں:

”یہ نہ سمجھو کہ میں تو ریت یا نیویوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔“

دستی ۵-۷: ۱۷

”و آسمان اور زمین کا کل جانا شریعت کے ایک نفلے کے مٹ جانے سے آسان ہے۔“

(لوقا ۱۶: ۱۷)

انجیلی زبان میں شریعت سے مراد شریعت موسوی ہی ہے۔

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیح سے پوچھا کہ احکام دین میں اولین حکم کونسا ہے۔ جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام تو ریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔“ (دستی ۲۲: ۳۷-۳۸)

قرآن مجید اور انجیل کی مندرجہ بالا تصریحات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نئی شریعت لے کر تشریف نہ لائے تھے بلکہ اُن کا کام شریعت موسوی کی تجدید تھا۔ اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ”تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ناروا پابندیاں اور قیود تمہارے علمائے اپنی طرف سے تم پر عائد کر رکھی ہیں اُن کا بوجھ ہٹا کر نامیرے فریض رسالت میں داخل ہے۔ چنانچہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کا ارشاد ہے:

”اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دیے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن۔“

کی تجدید کی ذمہ داری ہی سونپی گئی تھی اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی کہ لوگوں کے اندر روح کی پاکیزگی، تقویٰ اور طہارت پیدا ہو۔ عبادات کے خارجی مظاہر پر زور دینے کے بجائے سیدنا مسیح علیہ السلام نے تعلق باللہ پر زور دیا۔ ان کے مقابلے میں یہودیوں کے نزدیک اصل اہمیت مذہب کے ظاہری اعمال اور مذہبی رسوم و قیود کو حاصل تھی۔ اور ان اعمال کی روح سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اس طرح یہودیوں اور مسیحیت کے علمبرداروں کے مابین آویزش نے جنم لیا۔ اس کشمکش نے بالآخر یہ خوفناک صورت اختیار کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو شولی پر چڑھانے کے منصوبے تیار ہوئے مگر ماری تعالیٰ نے یہودیوں کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہودیوں کی اس شرارت نے جلتی پرتیل کا کام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھرنے والوں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کے درمیان منافرت اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور ان دونوں نے ایک دوسرے سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ تعلقات کی یہ کشیدگی مذہب پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں نے اپنی کتاب انجیل کو بھی دوسری کتب مقدسہ سے الگ کر کے صرف اس کی پیروی پر اکتفا کیا اور باقی کتب کو کمزیر نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کو پڑھتے ضرور ہیں مگر ان کے

۳۔ تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جو لازم ہے اور میرا بوجھ ہلکا ہے۔ (متی ۱۲: ۲۳-۲۵)

جس امر کی طرف سید قطب شہیدؒ نے سرسری اشارہ کیا ہے اُسے میں نے قدرے صراحت کے ساتھ اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ نکتہ اُن کی ساری بحث کا مدار ہے۔ وہ دراصل ثابت یہ کر رہے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں دین اور دنیا کی تفریق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ شریعت موسوی کے ہی پیرو اور مجدد تھے، مگر جب یہودیوں اور نصرائیوں کے درمیان دشمنی شدت اختیار کر گئی تو نصرائیوں نے شریعت موسوی کو "لعنت" قرار دے کر چھوڑ دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امور دنیا کے متعلق عیسائیوں کے پاس سرے سے کوئی آسمانی ضابطہ اخلاق باقی نہ رہا اور عیسائیت بندے اور خالق کے درمیان محض ایک نجی تعلق بن کر رہ گئی (مترجم)، لہذا حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ شریعت موسوی اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود یہودیوں کی زندگی پر کوئی پاکیزہ اثر مرتب نہیں کر رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کے دلوں میں محبت الہی ختم ہو گئی تھی اور وہ باطنی پاکیزگی جاتی رہی تھی جو کسی شریعت کی پیروی کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا سارا زور لوگوں کے اندر یہی چیز پیدا کرنے پر صرف کیا۔ (مترجم)

کسی حکم کی پیروی نہیں کرتے، نہ ہدایت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کو سخت وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی اسرائیل کی پوری شریعت تو رات ہی میں موجود ہے اور اس کی تجدید کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اب جبکہ دینِ مسیحی کے علمبرداروں نے شریعتِ موسوی کا مقاطعہ کیا تو ان کے پاس ایسی کوئی شریعت باقی نہ رہی جو تعلق باللہ کی اساس پر ان کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل کرتی۔ اس پر فریڈ سٹیم یہ ہوا کہ وہ اعتقادی تصورات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے وہ بھی بدقسمتی سے جوڑ کے توں محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر وہی زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ جاتے تو کم از کم ایک ایسا نظام فکر تو معرضِ وجود میں آتا جس میں اس کائنات کے اندر انسان کے مرتبہ و مقام کو شخص اور اس کی زندگی کے مقاصد کو متعین کیا جاسکتا تھا اور اس طرح اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے کوئی صحیح بنیاد فراہم ہو سکتی۔ نیز اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ عیسائیوں کے اہل علم خدائی ہدایت کی ضرورت محسوس کر کے شریعتِ موسوی کی طرف پھر رجوع کرتے اور علماء یہودیوں کی خود ساختہ پابندیوں سے اگ کر کے اصل شریعت کے احکام اس میں سے چھانٹ لیتے۔ مگر اس کے برعکس عالم واقعات میں ہوا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو یہودیوں اور رومیوں پرستوں کے ہاتھوں شدید مصائب اٹھانے پڑے اور وہ بچا رہے اس بات پر مجبور ہوئے کہ دعوتِ دین کا کام چھپ چھپا کر ان ظالموں کی نظروں سے بچتے ہوئے کریں۔ ان سنگین اور نامساعد حالات میں انہوں نے انجیل کی بعض نصوص اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں بعض تبدیلیاں کر دیں اور تبدیلی کا یہ عمل اس توڑ کے ساتھ جاری رہا کہ تعلیماتِ ربانی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذاتی تاثرات اور خیالات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ اب ان میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ پھر راویوں کے اختلاف کی وجہ سے انجیل کے مندرجات میں بھی اختلاف رونما ہوا، اور اس طرح متعدد ناجیل معرضِ وجود میں آئیں۔ ان ناجیل کی حیثیت کتب سماوی کی نہیں بلکہ روایات کے دفاتر کی سی ہے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے افکار و اعمال کو قلمبند کیا گیا ہے۔

یورپ میں مسیحیت پولوس (سینٹ پال) کے ذریعہ پہنچی۔ یہ شخص مسیحیت کا حلقہ بگوش بننے سے پہلے

بت پرست تھا۔ اسے نہ تو حضرت مسیح کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ اس نے اُن کی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کی۔ اس نے رومی بت پرستی کے بہت سے غلط تصورات کو دین مسیحی میں شامل کر کے یورپ میں اُن کا پرچار شروع کر دیا۔ عیسائیت کی یہ دوسری بد نصیبی تھی کہ اُسے پولوس کی ذات میں ایک ایسا مبلغ ملا جو نہ تو مسیحی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھا اور نہ دینی جذبہ و احساس کے اعتبار سے مخلص تھا۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے قریباً سو سال بعد کئی ایک رسائل لکھے جن میں مذہبی معتقدات کے اندر فلسفیانہ مویشگائیاں پیدا کرنے کے ڈھنگ بنائے گئے تھے اور اُن کا عملی مظاہرہ بھی موجود تھا۔ خصوصاً مسئلہ حلول کا تو یہ شخص زبردست داعی اور مبلغ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مسیح خدا کے بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے بھلائی کے طلبکاروں کو اس کی عام طور پر یہ نصیحت ہٹا کرتی تھی کہ وہ کلمۃ اللہ کو اپنے اندر جذب کریں اور بخشش کے لیے اُس کی طرف رجوع کریں۔ وہ عوام کو انبیاء کی طرح بشارتیں دیتا اور کہتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جلد ہی جب واپس آئیں گے تو وہ انہیں غیر معمولی عزت و شرف سے بہرہ ور کریں گے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو "ہمارا خداوند یسوع مسیح" کہہ کر بجاتا اور اپنے آپ کو "رسول یسوع مسیح" کے معزز نقیب سے ملقب کرتا۔ پولوس کی دعوت جب پھیلنے لگی تو لوگ غلطی سے اسے عیسائیت کی کامیابی و کامرانی سمجھ کر خوش ہوئے۔ پھر جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے دین مسیحی کو قبول کیا تو عوام کے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے یہ سمجھا کہ اب عیسائیت ایک حکمران طاقت بننے کی وجہ سے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کرے گی ایک امر کی منکر اپنی کتاب "دین اور علم" میں اسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

"منافقین کے اثر و سرخ کی وجہ سے مسیحیت کے اندر شرک اور بت پرستی کے جراثیم داخل ہو گئے۔ یہ منافقین رومی حکومت کے بڑے بلند مناصب پر فائز ہونے والے اور خطیر معاوضے پانے والے عہدیدار تھے۔ بظاہر تو یہ مسیحیت کی محبت کا دم بھرتے تھے مگر ان سے اس دین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی دین سے ناواقفیت تھی اور دوسری وجہ ان کی منافقت۔ انہیں دین حق کے ساتھ مخلصانہ تعلق نہ تھا۔ خود قسطنطین اس جہالت اور منافقت کا پیکر تھا۔ اس کی پوری عمر ظلم اور فسق و فجور میں گزری اور عمر کے آخری چند برسوں کے سوا اُس نے

احکام دین کو کبھی درخورد اعتنائے نہ سمجھا۔ اس نئے دور میں ملتِ مسیحی بظاہر بڑی طاقتور نظر آرہی تھی، کیونکہ بادشاہِ قسطنطین اس کی غلامی کا وعویدار تھا، مگر درحقیقت اس کے اندر زبردست انحلال پیدا ہو چکا تھا اور اس بنا پر یہ بت پرستی کا طبع قمع کرنے اور شرک کے جرائم برباد کرنے میں سخت نامام رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فروعات تو ایک طرف رہیں، اس کے معتقدات اور بنیادی تصورات تک میں باطل کی آمیزش ہو گئی اور اس طرح مذہب کا ایک ایسا طغویہ تیار ہوا جس میں عیسائیت اور بت پرستی کے اجزائے شامل تھے۔ یہ وہ تمام ہے جہاں سے اسلام اور عیسائیت کے درمیان بعد و بگاڑی شروع ہوتی ہے۔ اسلام شرک اور بت پرستی کا دشمن ہے۔

یہ فرمانروا قسطنطین جو خالص دنیا پرست تھا، جو ہر معاملے کو ذاتی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا، اُس کی نظر میں دینی عقائد کی اثر کیا اہمیت اور ان کا کیا وزن ہو سکتا تھا۔ اُس نے ذاتی مفادات کے لیے دو متحارب گروہوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے تابعین اور بت پرستوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُس دور کے مخلصین اور دین سے گہری محبت رکھنے والوں نے اس غلط روش پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اُن کا یہ خیال تھا کہ دین کا یہ پیام کب چونکہ فطری طور پر غلط ہے اس لیے یہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو جائے گا اور بت پرستانہ عقائد و نظریات خود بخود ٹٹتے چلے جائیں گے اور اس طرح دین پاک اور منترہ ہو کر انسانوں کی رہنمائی کے لیے زندہ رہ جائے گا۔ مگر افسوس کہ مقدس مذہبِ گروہ کی یہ توقعات توقعات ہی رہیں، شرمندہ تعبیر نہ ہو سکیں۔ دین حق شرک اور بت پرستی کی آلائشوں سے پاک نہ ہو سکا۔ توحید اور بت پرستی کی آمیزش میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور بعد میں مسیحی معتقدات اور تصورات پر سیاسی آویزش کی بھیانک پرچھائیاں پڑنے لگیں۔“

توحید اور بت پرستی کی اس آمیزش کو مذہبی لحاظ سے کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دینی عقائد و نظریات کی کوئی ایسی تفسیر و تعبیر کی جائے جو مختلف اور متخالف گروہوں اور قوموں کے لیے قابل قبول ہو، جو کئی لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ذہنی اطمینان کا باعث بن سکے۔ اس غرض کے لیے

۱۵۵۱ء میں خلفدونیہ (C:IAL CEDON) کے مقام پر عیسائیوں کا ایک زبردست اجتماع ہوا جس میں مسیح کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا کہ وہ کئی مختلف اور متضاد صفات کے جامع ہیں اور یہ صفات اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ ان کی ذات کے اندر جمع ہیں۔ وہ الوہیت، بشریت اور روح کے مظہر ہیں اور اس طرح بیٹا، باپ اور روح القدس ایک ہی جسد میں جلوہ گر ہیں۔ اتانیم ثلاثہ کا تصور توحید پرستی اور بت پرستی کی آمیزش کی علامت ہے۔

فرقہ یقینوں نے اس اعلان سے شدید اختلاف کیا۔ یہ گروہ ایک ذات کے اندر تین مختلف اور متضاد صفات کی یکجائی کا قائل نہ تھا۔ بلکہ اس ذات کو تین اتانیم کا مرکب و مجموعہ سمجھتا تھا۔ یہ اختلاف کافی مدت تک چلتا رہا۔ یعقوبی گروہ مصر و شام اور رومی سلطنت کے دور دراز گوشوں میں کافی زور پکڑ چکا تھا۔ بہر حال ان کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کے لیے یہ نیا تصور دیا کہ مسیح ایک ہی طرح کی مشیت کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جسد واحد کے اندر اگرچہ رجحانات مختلف اور متضاد ہیں مگر ان کے پیچھے ایک ہی ارادہ کار فرما ہے۔ بہر حال کی یہ تصریح جو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان مفاہمت کی غرض سے پیش کی گئی تھی کامیاب نہ ہو سکی اور اس پر برگر گروہ نے اظہارِ اطمینان کرنے کے بجائے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات ستورہ صفات کے بارے میں یہ مختلف من گھڑت تصورات جو موجدین اور بت پرستوں کے دو متضاد خیال گروہوں کے درمیان مصالحت کی غرض سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے مسیحیت کے لیے بڑے تباہ کن ثابت ہوئے۔ انہوں نے دینِ مسیحی کو صحیح اور غلط تصورات کا ایک ایسا مغزوبہ بنا دیا جس کے صحیح اجزا کو باطل سے الگ نہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک ابہامی مذہب سے بدل کر عجیب و غریب اور چمپیدہ ادکار و نظریات کا محض ایک گرہ رکھ دھندا بن کر رہ گیا تھا جس سے عوام کو دھوکے تو دینے جاسکتے تھے مگر حق و صداقت کی راہ منور نہ کی جاسکتی تھی۔ اس دین میں اب وہ صلاحیت ہی باقی نہ رہی تھی جس سے خدا کے وجود کا صحیح تصور پیش کیا جاسکتا، خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت معلوم کی جاسکتی، یا صفاتِ الہی کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگایا جاسکتا، یا اس کی طرف رجوع کر کے یہ معلوم ہو سکتا کہ وجود انسانی کی حقیقت کیا ہے اس وجود کو کس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم جب تک انسانی فطرت کے ان بنیادی اور اساسی سوالات کا ٹھیک جواب نہیں دے لیتے کسی کامیاب متوازن اور منظم اجتماعی زندگی کی تشکیل ممکن نہیں ہو سکتی۔